تدوین حدیث

(۶)

محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

لیکن ہمیشہ اس قسم کے حالات عارضی حالات ہی کی شکلوں میں نمودار ہوئے ہیں، چونکہ کے بعد پھر اپنے اصلی مسلک کی طرف لوگ واپس ہو گئے جس کی وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں کا سارا کتب خانہ ان معلومات سے معمور ہے، جونہی جہل کا ازالہ ہوا، صحیح معلومات اور صحیح مسلک لوگوں کے سامنے آگیا۔ آیندہ اگر توفیق رفیق ہوئی اور زندگی نے ساتھ دیا اور تدوین حدیث کی اس تاریخ کی تکمیل کا موقعہ ملا تو انشاء اللہ ان قصوں کو بیان کیا جائے گا۔ اس وقت تو صرف بتلانا مقصود ہے کہ اپنے عہد خلافت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی دین کے اس شعبہ کی خصوصیتوں کی حفاظت اور نگرانی کی پوری کوشش کی، جذبات کے فوری تاثرات کے زیر اثر حدیثوں کے قلم بند کرنے کا ایک غیر صحیح اقدام ان کی طرف سے جو ہو بھی گیا تھا، اس کی فوراً آپ نے اصلاح فرما دی، بلکہ لکھنے کے بعد اس مجموعہ کو جلا دینے سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء مبارک کی جیسا کہ میں نے عرض کیا نئے سرے سے تازہ تجدید ہو گئی، اگر یہ صورت نہ پیش آتی تو یہ سوال ہی کا ہے کو اٹھتا کہ لکھنے کے بعد جلانے کی مصلحت کیا تھی۔ خصوصاً جب خود ان ہی کا بیان ہے کہ علاوہ اپنے براہ راست معلومات کے ان ہی لوگوں کی روایتیں اس کتاب میں درج کی گئی تھیں جن کی امانت و وثاقت پر اپنے نزدیک ان کو اطمینان تھا۔ حضرت کو الفاظ

فیھا احادیث عن رجل	اس میں حدیثیں ایسے آدمی سے لی گئی ہیں جس کی
قد ائتمنتہ و وثقتہ	امانت پر میں نے بھروسہ کیا اور اس کے بیان پر اعتماد کیا

کا ظاہر ہے کہ یہی مطلب تھا، مگر باوجود اس کے لکھنے کے بعد اس کو جلا دینا جیسا کہ بہ تفصیل عرض کیا گیا اس کی وجہ وہی نبوی منشاء کی تکمیل ہی ہو سکتی ہے جس کے متاثر ہونے کا خطرہ حضرت ابو بکر کے اس جمع کردہ نسخے سے پیدا ہو گیا تھا۔

لیکن حضرت ابو بکر کا کام تدوین حدیث کے سلسلے میں صرف ان ہی دو خدمات تک محدود نہیں ہے افسوس ہے کہ کتابوں میں ان کی اس خدمت کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن شاید اس کی اہمیت کا اندازہ جیسا کہ چاہئے تھا لوگوں کو نہ ہوا۔ بات میں ممکن ہے کچھ طوالت پیدا ہو لیکن کیا کیا جائے مجھ سے پہلے کام لینے والوں نے اختصار سے کام لیا میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جس اہمیت کے مستحق تاریخ کے یہ وثائق تھے ان کی اس اہمیت کا اندازہ اچھے اچھوں کو نہ ہو سکا۔

کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ بجائے عمومی اشاعت کے دین کے اس حصہ کے متعلق یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا کہ پہونچانے کی حد تک وہ پہنچا تو دیا جاتا لیکن عموماً ہر شخص تک پہنچ جائے اس کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ جیسا کہ بتایا گیا اسی سے مسلمانوں کی دینی زندگی میں اس حصہ کے لحاظ سے سہولتیں پیدا ہوئیں جو ان سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی راہ کھلی ہوئی ہے لیکن محروموں کی محرومی میں اس لئے اضافہ نہیں ہوتا کہ اس حصہ کے مطالبہ و گرفت میں وہ نوعیت نہیں پیدا ہوتی جو مبنیاتی حصہ کی خصوصیت ہے، مگر اسی کے ساتھ ایک دوسرا نتیجہ یعنی ان روایتوں کے جاننے والوں اور جو ان سے ناواقف تھے ان دونوں طبقوں میں اختلاف کا پیدا ہو جانا واقفیت اور عدم واقفیت کی وجہ سے ناگزیر تھا ابھی کچھ دیر پہلے حضرت عمرؓ ہی کے متعلق دو قصے اس سلسلہ میں گذر چکے، معمولی آدمی نہیں حضرت عمرؓ جیسی شخصیت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثوں یعنی استیذان (اجازت) کے خاص طریقے اور بیت المقدس والی مسجد کے اس قصے سے جس کا ذکر میں نے حاشیہ میں کیا ہے آپ سن چکے وہ ناواقف تھے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکر دوسرے صحابیوں سے فرمایا تھا واقعہ یہ ہے کہ دین کے اس حصہ کو جس طریقہ سے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہونچایا تھا ایسی صورت میں بعضوں کا اس سے واقف ہونا اور بعضوں کا ناواقف رہ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہوسکتی، خصوصاً جن لوگوں کو معاشی یا اسی قسم کے دوسرے کاروبار کی وجہ سے چوبیس گھنٹہ کی حاضرباشی کا دربار نبوت میں موقعہ میسر نہ تھا استیذانا والی روایت میں خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اعتراف کرنا پڑا۔

خفی علی هذا من امر رسول اللہ	یعنی روایت مجھ سے جو مخفی رہی تو اس کی وجہ یہ ہے
صلی اللہ علیہ وسلم الھانی عنہ	کہ بازاروں کے کاروبار کی مشغولیت نے اس کا
الصفق فی الاسواق ج۲ ص۱۲۹ جمع الفوائد	موقعہ میرے لئے نہیں رکھا تھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی کثرت روایت کی وجہ بیان کرتے ہوئے بھی یہی کہتے تھے کہ

ان اخوانی من المهاجرین کان	میرے دوسرے مہاجر بھائیوں کو بازاروں کے
یشغلهم الصفق فی الاسواق	کاروبار نے اپنے ساتھ مشغول رکھا مگر میں تو صرف
وکنت الزم رسول اللہ صلی اللہ	پیٹ پر رسول اللہ کے آستانے پر پڑا ہوا تھا۔
علیہ وسلم علی ملاء بطنی	

غالباً ابوہریرہؓ کی اس پوری روایت کا ذکر کہیں پہلے بھی آچکا ہے حاصل اس کا یہی تھا کہ مہاجرین تو بازار کے کاروبار میں عموماً مشغول رہتے تھے اور انصار کو اپنے باغوں اور کھیتوں کی وجہ سے زیادہ فرصت میسر نہیں آتی تھی البتہ یہ فقیر ابوہریرہ صرف پیٹ پر پیغمبر کے آستانے پر پڑا ہوا تھا اسی کا نتیجہ یہ ہوا جیسا کہ خود ان کا بیان ہے کہ فاشهد اذا غابوا واحفظ اذا نسوا میں اس وقت حاضر رہتا تھا جس وقت یہ لوگ غایب رہتے تھے اور جن باتوں کو دوسرے بھول جاتے تھے مجھے حاضر باشی کی وجہ سے یاد رہ جاتی تھیں، کیونکہ بار بار سننے کا موقعہ ملتا تھا۔

اگرچہ یہ باتیں کس نوعیت کی ہوتی تھیں اس کا اندازہ حضرت عمرؓ والی ان ہی دو روایتوں سے ہوسکتا ہے، "ستیذان اصولی طور پر ایک قرآنی قانون ہے، قرآن ہی میں حکم دیا گیا ہے کہ کسی دوسرے گھر میں بے دھڑک بغیر اجازت مسلمانوں کو گھسنا نہ چاہئے، بلکہ صاحب خانہ کو مانوس

تھا کہ اور سلام کلام کرکے داخل ہونا چاہئیے قرآنی قانون ہونے کی وجہ سے اس کی تبلیغ عام ہو چکی تھی باقی سلام کتنی دفعہ کرنا چاہئیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر عمومی طریقہ سے لوگوں کو تعلیم دی تھی کہ تین دفعہ سلام کرنے کے بعد بھی جواب نہ ملے تو پلٹ جاؤ جس پہ تین دفعہ سلام کرنا اس کی عمومی اشاعت مسلمانوں میں ضروری نہ تھی، ـــــــــــــ پس استیذان یعنی کسی گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت طلبی کے وقت سلام کرنے کا جو قرآنی حکم ہے اسی حکم کی یہ تفصیل کہ تین دفعہ سلام کیا جائے یہ ایسا مسئلہ تھا جو عمومی اشاعت پانے والے مسائل کی حیثیت نہیں رکھتا تھا اسی طرح بیت المقدس کے متعلق حضرت داؤدؑ کا قصہ سو ظاہر ہے کہ ایک تاریخی واقعہ تھا ہر تاریخی واقعہ کی تبلیغ ہر شخص تک کھلی ہوئی بات ہے کہ فرائض نبوت میں داخل نہیں ہے بقول ابوبکر الجصاص

لیس علی النبی صلی اللہ علیہ	یعنی جن امور میں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے ان
وسلم توقیفھم علی الافضل	کے اس پہلو سے امت کے ہر فرد کو آگاہ کرنا جو
مما خیرھم فیہ تفسیر جصاص ۱۲	بہتر اور افضل ہو، یہ پیغمبر کے لئے ضروری نہیں ہے

اسی لئے بعضوں تک پیغمبر کی اس قسم کی باتیں پہونچیں اور بعضوں تک نہ پہنچیں۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی کہ مسلمانوں کی سہولت اور آسانی کے لحاظ سے اس کی جو کچھ بھی قیمت ہو لیکن جاننے والوں اور نہ جاننے والوں کے درمیان اختلاف کا پیدا ہو جانا اس کا ایک لازمی و ناگزیر نتیجہ تھا۔ اسی کے ساتھ شرعی قوانین کی محدودیت اور قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے ساتھ پیش آنے والے حوادث و واقعات کی لامحدودیت نے اس ضرورت کو جو پیدا کیا تھا کہ شرعی کلیات کو پیش نظر رکھ کر انہی محدود قوانین کی روشنی میں نت نئی پیش آنے والی صورتوں کے لئے احکام پیدا کئے جائیں جس کا اصطلاحی نام فقہ ہے، دین اور وہی دین اسلام جو مدعی ہے کہ ہر وہ شخص جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت و رسالت کے بعد انسان بن کر زمین کے کرہ پر قیامت تک پیدا ہوتا رہے گا اس کے لئے یہ آخری قانون ہے، ایک ایسے عالمگیر وسیع

دینی آئین کے لئے تفقہ کے اس باب کا کھلا رکھنا کس حد تک ضروری ہے اس کا اندازہ آپ کو عام دنیاوی قوانین کے ماہرین کے بیانوں سے ہو سکتا ہے۔ حالاں کہ کسی محدود علاقے کے لئے محدود زمانے میں حکومتیں ان قوانین کو بناتی ہیں، لیکن باوجود اس کے جیساکہ سر سامنڈ نے اپنی مشہور کتاب "اصول قانون" میں لکھا ہے

"بہر حال کسی ملک کے ججوں کے اختیار تمیزی کے بغیر صرف قانون سے انفصال مقدمات ناممکن ہے"

(مترجمہ دار الترجمہ سرکار عالی ص)

تفصیل کے لئے تو دیکھئے میری کتاب "تدوین فقہ" یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ "تفقہ" کی اسی ناگزیر صورت حال سے اختلافات کا پیدا ہو جانا لابدی تھا اور وہ پیدا ہوا، مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کا ایک بڑا حصہ عموماً ان ہی دونوں باتوں یعنی احاد خبروں کی واقفیت وعدم واقفیت پر مبنی ہے یا ان اجتہادی نقاطِ نظر پر ہے جن کا پیدا ہو جانا اجتہادی کوششوں میں قدرتی امر ہے اور خواہ ان اختلافات کے متعلق نہ جاننے والوں میں جس قسم کے خیالات بھی پھیلے ہوتے ہوں[1] مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ

---

[1] میرا اشارہ اس عام چرچے کی طرف ہے جو مسلمانوں کے متعلق پھیلا ہوا ہے کہ بدترین قسم کی فرقہ بندیوں میں یہ قوم مبتلا ہے غیر تو غیر اپنوں کو بھی اس پر طامات چھاتی پیٹتے دیکھا گیا ہے لیکن جو اصل واقعہ ہے اسے اپنی مختلف کتابوں مقالات و مضامین میں بہ تفصیل بیان کر چکا ہوں حاصل یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں فوج در فوج دنیا کی قومیں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں تو اس میں شک نہیں کچھ دن کے لئے جیساکہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے نت نئے خیالات وعقائد کے رکھنے والے فرقے پیدا ہو گئے تھے ان میں بعض فرقوں کی بنیاد تو سیاسی اختلافات پر مبنی تھی اور بڑی تعداد ان فرقوں کی تھی جو اسلام میں اپنے موروثی مذہب کے جراثیم کو لئے ہوئے داخل ہوتے تھے، شعوری یا غیر شعوری طور پر شروع میں یہ چاہا گیا کہ اسلامی تعلیمات اور ان کے موروثی خیالات میں تطابق و مصالحت پیدا کی جائے اسی غیر محمود کوشش نے جہاں تک میرے معلومات کا اقتضا ہے ان مختلف فرقوں کو اسلام میں پیدا کر دیا تھا لیکن جوں جوں آئندہ نسلوں کے قدم حقیقی اسلام میں راسخ ہوتے چلے گئے آبائی موروثات کا دباؤ ڈھیلا پڑتا گیا، صحیح اسلام جوں جوں نو مسلموں کے سامنے بے نقاب ہوتا چلا گیا اپنے آبائی خیالات سے ان کا تعلق کمزور ہوتا رہا تا آں کہ جو تھی پانچویں صدی ہجری تک پہنچتے پہنچتے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ان ہی اختلافات کے سلسلے میں یہ عجیب و غریب صورتِ حال جو نظر آ رہی ہے کہ مسلمانوں کی قوم حالانکہ دنیا کے مختلف اقالیم و ممالک میں کروڑہا کروڑ کی تعداد میں پھیلی ہوئی ہے۔ تخمینہ کرنے والے افراد کے نزدیک چالیس سے ستر کروڑ افراد انسانی پر یہ قوم مشتمل ہے جن میں مختلف زبانوں کے بولنے والی سیکڑوں نسلیں بنی آدم کی شریک ہیں۔ ان میں گورے، کالے، زرد، گندمی الغرض ہر رنگ اور ہر شکل کے لوگ ہیں لیکن بایں ہمہ بجز ایک فرقہ کے جن کی اقلیت اتنی ناقابلِ لحاظ اقلیت ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے مقابلہ میں گویا ان کا وجود و عدم سمجھنا چاہئے کے برابر ہے یہ ساری عظیم اکثریت اہل السنت والجماعت کے ایک ہی فرقہ کی شکل میں جو پائی جاتی ہے۔ لوگ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بہ تدریج یہ رنگ اتنا شاکہ یہ سارے فرقے خود بخود مضمحل ہو کر ناپید ہو گئے صرف مسلمانوں کی مذہبی تاریخوں میں لوگ ان فرقوں کا نام لکھتے ہیں لیکن دنیا سے ان کا وجود معدوم ہو چکا ہے معمولی چھوٹے ناپرسان حال فرقوں ہی کا یہ انجام نہیں ہوا بلکہ بعض بڑے منہ زور، صاحب السیف والقلم فرقے مثلاً معتزلہ تک کا یہ حال ہے کہ اس وقت اس فرقہ کے کسی آدمی کا ملنا تو دور کی بات ہے، کتب خانوں میں اس مذہب کے عقائد و خیالات کی کوئی خالص کتاب بھی نہیں پائی جاتی لغت یا تفسیر وغیرہ کے سلسلے میں گنتی کی چند کتابیں ہیں ان میں کچھ ان کے خیالات ملتے ہیں یا اہلِ سنت نے تردید کے لئے ان کے مسلمات کا اپنی کتابوں میں جو ذکر کیا ہے اس سے کچھ ان کے خصوصیات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ باقی حنفی، شافعی، مالکی و حنبلی فقہ کے یہ چار مکاتبِ خیال بلا شبہ مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کے اختلافات پر فرقہ بندی کے اختلافات کا اطلاق قطعاً غلط ہے آخر جب ان میں ہر مکتب کے لوگ دوسرے مکتبِ خیال کے ائمہ و اکابر کا اسی قدر احترام کرتے ہیں جتنا اپنے بزرگوں کا تو پھر ان میں کسی ایک جماعت کے دین کو دوسری جماعت کے دین سے جدا کیسے قرار دیا جا سکتا ہے یہی نہیں ہر ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں، ازدواجی تعلقات رکھتے ہیں۔ بلکہ حد یہ ہے کہ ایک جماعت کے لوگ دوسری جماعت کے پیروں کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں حضرت غوث پاک کا وجود اس کی سب سے بڑی مثال ہے کہ فقہاً حضرت حنبلی مسلک کے پابند تھے لیکن ایسا کون سا مسلمان ہے جو آپ کو سید الاولیا نہیں مانتا واقعی فرقہ کا اطلاق صرف شیعوں پر یا خوارج پر ہو سکتا ہے سو خوارج کا وجود کروڑہا کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے قابلِ ذکر نہیں رہا شیعہ فرقہ کے مسلمانوں کی تعداد اس میں شک نہیں کہ خوارج سے زیادہ ہے لیکن اہلِ سنت کی اکثریت کثیرہ عظیمہ کے مقابلہ میں سچ پوچھئے تو ان کی تعداد بھی سمندر میں چند تنکوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

اس کو کیوں نہیں سوچتے کہ اختلافات کے ان دو مستقل آتش فشاں پہاڑوں پر جس قوم کی دینی زندگی کی تعمیر کھڑی کی گئی ہے، اسی دین میں وحدت و یگانگت کا یہ حیرت انگیز مگر ساتھ ہی دلکش رنگ کیسے پیدا ہو گیا؟ کیا یہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے لوگوں کا مطالعہ اگر صحیح ہوتا تو ان کے سامنے ان سارے انتظامات، اور استقراری و احتیاطی تدبیروں کا نقشہ آجاتا جو شروع ہی سے اس راہ میں اختیار کئے گئے عہدِ نبوت میں تو اختلافات کے پیدا ہونے کی گنجائش ہی کیا تھی، پیغمبر کا وجود قولِ فیصل تھا جو براہِ راست خدا سے علم پا رہے تھے، ہر اختلاف کا فیصلہ پیغمبر کی طرف رجوع کرنے کے ساتھ ہی ہو جاتا تھا۔ قرآن ہی میں بار بار مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا تھا کہ ہر اختلاف میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو تاہم ایک چیز اس زمانہ میں بھی پیدا ہو چکی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسی کو اصلاح کا ذریعہ بنایا تھا۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اختلافاتِ باہمی سے مسلمانوں کو جو منع کیا گیا ہے، ہمیں سوچنا چاہیے کہ واقعی اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا ہر مسلمان کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہی معلومات اپنے پاس رکھے جو دوسرے رکھتے ہیں، یا یہ کہ ہر مسلمان وہی بات سوچے جو دوسرے سوچتے ہیں، مگر غور کرنا چاہئے کہ کیا یہ ممکن بھی ہے؟ خصوصاً دین کے اس ثانوی حصہ کو جب پیغمبر اس طریقے سے پہونچا رہے تھے کہ اور تو اور ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے مقربین بارگاہ کو بھی بسا اوقات اس سلسلے میں اپنی ناواقفیت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا ایسی صورت میں یہ خیال کہ معلومات کے اختلاف سے جو اختلاف قدرتاً پیدا ہوتا یا ہو سکتا تھا اس سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے خود ہی سوچئے کہ اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اسی طرح جب تفقہ کا باب کھولا گیا تھا اور عرض کر چکا کہ عملی طور پر کوئی دنیوی قانون بھی اس کے بغیر چل نہیں سکتا تو قیامت تک کیلئے ساری دنیا کے لئے جو دینی دستور دیا گیا تھا وہ اس دروازے کے بند کرنے کے بعد نت نئی روزانہ پیش آنے والی صورتوں اور ضرورتوں کی تکمیل کی ضمانت کیسے دے سکتا تھا اور تفقہ کے دروازے کو کھلا رکھنے کے بعد یہ توقع کیا پوری ہونے والی توقع ہو سکتی ہے کہ شرعی کلیات اور نصوص کو پیش نظر رکھ کر نئے پیش آنے والے حوادث کے متعلق

حکم پیدا کرنے والے ہمیشہ ایک ہی نتیجہ تک پہونچیں گے۔

میرے نزدیک تو اختلاف سے ممانعت کا اگر یہی مطلب لیا جائے گا تو دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سارے انسانوں کو حکم دیا جائے کہ اپنے چہروں کے رنگ کو ایک کر دو، اپنے قدوں کو برابر کرلو، ہر شخص ایک ہی قسم کی آواز منہ سے نکالے الغرض جو کچھ ایک کے پاس ہے مزیدی قرار دیا جائے کہ وہی سب کچھ دوسرے کے پاس بھی ہو اور وجہ یہ بیان کی جائے ان ہی چیزوں کے اختلاف سے لوگوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ حکم ہمیشہ ان ہی چیزوں کو دیا جاتا ہے یا دیا جا سکتا ہے جو آدمی کے اختیاری حدود میں ہوں۔ بھلا غریب آدمی کے بس میں ہے کہ اپنے چہروں کے رنگ و روغن، شکل و صورت، قد و قامت، چال ڈھال وغیرہ قدرتی اختلافات اور انفرادی خصوصیتوں کو مٹا کر ایک کر دے اور جیسے یہ اس کے بس کی بات نہیں، یقین کیجئے کہ ذہنی اور دماغی یا باطنی خصائل و غرائز کے فطری اختلافات جن کی وجہ سے فکری اختلافات پیدا ہوتے ہیں ان اختلافات کو بھی آدمی اپنی قدرت اور اپنے ارادے سے مٹا نہیں سکتا۔ بس یہ کہنا کہ تفقہ میں ہر مسلمان فقیہ کو اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ جس نتیجہ تک شرعی قوانین کی روشنی میں دوسرے پہونچیں اسی نتیجہ تک وہ بھی پہونچے اور یہ باور کیا جائے یا کرایا جائے کہ اس حکم کی تعمیل سے قاصر رہنے والے قرآن کے ان مطالبوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں جن میں مسلمانوں کو تفرق و اختلاف سے بچنے کی شدید تاکیدیں کی گئی ہیں اور عذاب عظیم کی دھمکیاں دی گئی ہیں ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کوئی معمولی دعویٰ نہ ہوگا، مسلمانوں کی تاریخ کے سارے روشن اوراق یقیناً اس کے بعد اچانک سیاہ پڑ جائیں گے، میں اوروں کے متعلق تو نہیں کہتا کہ اس سلسلے میں ان کے خیالات کیا ہیں لیکن جہاں تک اپنی ناقص غور و فکر سے کام لینے کے بعد جس نتیجہ تک پہنچا ہوں، اسے پیش کر دیتا ہوں۔

میں تو یہی سمجھتا ہوں اختلاف و تفرق سے جن آیتوں میں مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے اگر ان کا مطلب یہی لیا جائے گا تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ اسی قسم کا مطالبہ ہوگا کہ کالے رنگ والوں

کو حکم دیا جائے کہ اپنے چہروں کو گورا بنالیں ورنہ عذاب عظیم کے وہ مستحق ہوں گے میرے نزدیک تو دونوں مطالبوں میں اصولاً کسی قسم کا فرق نہیں ہے پس سوچنے کی بات یہی ہے کہ قرآن جس اختلاف سے منع کر رہا ہے وہ ہے کیا؟ یقیناً یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی جس کی تعمیل انسانی دسترس سے باہر ہو آخر لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا یعنی وسعت اور گنجائش ہی کو دیکھ کر مطالبہ کیا جاتا ہے یہی تو قرآن ہی کا کلی قانون ہے جب ہر باب میں اس قانون کی ہمہ گیری مسلم ہے تو اختلاف کا مسئلہ اس کے دائرے سے کیسے باہر ہو سکتا ہے اس معیار پر اس مسئلہ کی جو واقعی حقیقت ہو سکتی ہے اسے متعین کیجئے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں یعنی وہی گورے اور کالے کے اختلاف کو دیکھئے، چہروں کے رنگ کے اس اختلاف کو یہ تو ظاہر ہے کہ آدمی ختم نہیں کر سکتا گوروں کو کالا اور کالوں کو گورا یا رنگینوں کو پھیکا، اور پھیکوں کے چہروں پر وہ رنگ نہیں بھرے جا سکتے جو رنگین چہروں والے کی خصوصیت ہے لیکن اسی کے ساتھ اگر چاہا جائے تو چہروں کے رنگ کے ان قدرتی اختلافات کو مخالفت کا ذریعہ بنا کر بنی آدم کو مختلف ٹولیوں میں یقیناً بانٹا جا سکتا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ آئے دن یہ کیا جا رہا ہے کتنی بے دردی کے ساتھ رنگ کے اسی قدرتی اختلاف کو خوں ریز مخالفتوں کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے پس اختلاف تو ایک قدرتی بات ہے لیکن اس قدرتی اختلاف کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ بنانا یہ قطعاً انسان کی ایک مصنوعی حرکت ہے قدرتی اختلاف کو بند کرنا یہ تو ہمارے بس کی بات نہیں ہے مگر ان سے ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانی یہ بالکلیہ آدمی کی اختیاری چیز ہے، میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کو جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ اس مسئلہ کا یہی اختیاری پہلو ہے بالفاظ دگر مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ معلومات یا افکار و خیالات یا اجتہادی نتائج کے اختلاف کو چاہئے کہ باہمی مخالفتوں کا ذریعہ نہ بنائیں یعنی ان ناگزیر اختلافات کو بنیاد بنا کر ایک طبقے کے دین کو دوسرے طبقے کے دین سے جدا کرنے کے جرم کے مرتکب نہ ہوں قرآن اسی جرم سے مسلمانوں کو روکنا چاہتا ہے حاصل یہ ہے کہ جن اختلافات کا مٹانا، آدمی کے بس میں نہیں ہے ان کے مٹانے یا ختم کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے، بلکہ ان اختلافات

کو ارادی مخالفتوں اور مخاصمتوں کا یعنی ایک کے دین کو دوسرے کے دین سے جدا کرنے کا ذریعہ بنانا یہ فعل چوں کہ ہمارے اختیاری حدود میں داخل ہے، اس لئے درحقیقت اسی سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے اور منع کرنے کی چیز یہی ہو بھی سکتی ہے قرآن نے اس باب میں جو حکم دیا ہے وہ بالکل واضح اور متین ہے مثلاً ارشاد ہے۔

ولاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا	اور نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جن میں ایک دوسرے
من بعد ماجاءھم البینات واولئک	سے جدا جدا ہوئے اور مختلف ہوتے بعد اس
لھم عذاب عظیم (آل عمران)	بات کے ان کے پاس "بینات" آچکے تھے یہی
	لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں اختلفوا سے پہلے "تفرقوا" کا لفظ ہے جس سے اشارہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں اسی طرف کیا گیا ہے کہ لوگ دراصل تفرق کو پیدا کرنا چاہتے ہیں یعنی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنا چاہتے ہیں، تب اس جدائی کا ذریعہ مذہب کے اختلافات کو بنا لیتے ہیں، حالاں کہ "البینات" ان کے پاس موجود رہتا ہے۔

اسی آیت کو پیش نظر رکھ کر اسلام کا نقطۂ نظریہ سمجھ میں آتا ہے کہ دین کے جس حصہ کی حیثیت "بینات" کی ہو یعنی دین سے جس کا تعلق بالکل واضح اور روشن ہو، مثلاً وہ ساری چیزیں جو عمومیت کی راہ سے منتقل ہوتی ہوئی مسلمانوں میں چلی آرہی ہیں اسلام کے ساتھ ان کا تعلق اتنا واضح اتنا بیّن اور کھلا ہوا ہے کہ جو اسلام اور ان چیزوں کو جانتا ہے، خواہ مسلمان ہو یا نہ ہو شاید اسلام کا ان کے بغیر وہ تصور ہی نہیں کر سکتا مثلاً قرآن یا حج یا نماز رمضان کے روزے وغیرہ ان کا یہی حال ہے

بہرحال ان ہی "البینات" پر متفق و متحد ہو جانے کے بعد ہدایت کی گئی ہے کہ دین کے "غیر بیناتی" حصہ کو ذریعہ بنا کر مسلمانوں کی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنے کی حرکت جدا کرنے والوں کو عذاب عظیم کی مستحق بنا دیتی ہے حاصل یہی ہوا کہ قدرتی طور پر جن اختلافات کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے ان سے نہیں منع کیا گیا ہے اور نہ ان سے منع کیا جا سکتا ہے کہ اختیاری حدود میں دا

داخل ہی نہیں ہیں بلکہ ان ناگزیر قدرتی اختلافات کو چاہتے کہ باہم ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے ممانعت کا حقیقی رخ انسان کے اسی ارادی فعل کی طرف ہو سکتا ہے اور اسی کی طرف اس کا رخ ہے بھی،

میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا کہ عہدِ نبوت میں ان قدرتی اختلافات کے پیدا ہونے کی گنجائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود کی وجہ سے تھی ہی نہیں، تاہم اس وقت بھی اختلاف کی ایک صورت سامنے آہی گئی یعنی زبانوں کا دستور ہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے کیوں نہ ہوں لیکن ان لوگوں میں بھی تھوڑا بہت لہجہ طریقۂ ادا، تلفظ وغیرہ کے اختلافات پیدا ہی ہو جاتے ہیں کہنے والوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر بارہ میل پر زبانوں کے ان اختلافات کا تجربہ کیا گیا ہے ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہو، لیکن اس مشاہدے کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والوں میں مذکورہ بالا اختلافات کو ہر جگہ لوگوں نے پایا ہے، ہماری اردو زبان ہی کو دیکھ لیجئے، شمال و جنوب مشرق و مغرب کے اکثر ہندوستانی علاقوں میں یہ بولی جاتی ہے، لیکن باوجود ایک زبان ہونے کے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جنوبی ہند کے اردو بولنے والے ایک ہی لفظ کو اس طریقہ سے ادا کرتے ہیں کہ شمالی ہند والے اگر چاہیں بھی تو اس طریقہ سے اس لفظ کا تلفظ نہیں کر سکتے، اور یہی حال مختلف صوبجاتی مقامی اختلافات کا ہے۔ عربی زبان جس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ یہ زبان سارے عرب کی تھی۔ لیکن عرب کے مختلف علاقوں کے باشندوں کی زبان میں بھی وہ سارے اختلافات پائے جاتے تھے، جن سے کوئی زبان بھی ہوتی نہیں ہے۔ حجاز ہی میں، نجد یا مختلف قبائل قریش بنی تمیم، قحطانی، غیر قحطانی قبائل کے اندر اس قسم کے کافی لسانی اختلافات پائے جاتے تھے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جیسی جلیل ہستی جن کی ساری زندگی قریش میں بلکہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارک میں گذری۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو قرآن پڑھایا تھا، لیکن نسلاً واصلاً ہذلی تھے۔ اس لئے حتیٰ کا لفظ آخر عمر تک وہ عتیٰ کرتے رہے مسند احمد میں ہے کہ مشہور حدیث جس

میں ہے کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو صفات بیان کئے گئے ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ آپ دنیا سے اس وقت تک تشریف نہ لے جائیں گے جب تک ملت عوجاء (ٹیڑھی ملت) سیدھی نہ ہو جائے۔ جس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ لوگ لا الہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندھی آنکھوں اور بہرے کانوں اور جن قلوب پر غلاف چڑھے ہوتے ان کو اسی کلمہ لا الہ الا اللہ سے کھول دیں گے۔ عربی میں اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حتی یقیم بہ الملة العوجاء بان یقولوا لا الہ الا اللہ فیفتح بہا اعینا عمیا واذانا صما وقلوبا غلفا۔ حضرت عطا فرماتے تھے کہ میں نے کعب احبار سے جو توراۃ کے مستند عالم اس زمانہ میں سمجھے جاتے تھے ان سے پوچھا کہ آپ کا علم ان الفاظ کے متعلق کیا ہے یعنی تورات میں یہ الفاظ کیا پائے جاتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ کعب نے اس کی تصدیق کی صرف فرق یہ نظر آیا کہ

ان کعبا یقول بلغتہ اعینا عمومی	یعنی کعب بجائے اعینا عمیا کے اعینا عمومی اور
اذانا صمومی وقلوبا غلوفی	اذانا صما کے اذانا صمومی اور قلوبا غلفا کے
مسند احمد ص ۱۷۴/۲	قلوبا غلوفی کے ساتھ ان الفاظ کا اپنی لغت کی
	وجہ سے تلفظ کرتے تھے۔

درحقیقت یہ زبان کا اختلاف نہیں ہے بلکہ لہجہ کا اختلاف ہے جس کی تعبیر عطاء نے "لغت" کے لفظ سے کی ہے۔ کعب یمن کے رہنے والے تھے۔ حجازی لہجہ اور یمنی لہجہ کے فرق کا اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے "عمیا" کو کھینچ کر یمنی "عمومیا" اور "صما" کو "صموما"، "غلفا" کو "غلوفا" بنا دیتے تھے۔

(باقی آئندہ)